(ORGANIC) تعلق ہے جب تک معاشرے کو تبدیل کرنے کی کوشش نہیں ہوتی، بدعات کا استیصال آسان نہیں۔

ہمارا قدیم نظام تعلیم اور جدید تقاضے

قیام پاکستان سے قبل مغربی پاکستان میں قدیم نظام تعلیم پر عامل عربی و دینی دارالعلوم نہ اتنی زیادہ تعداد میں اور نہ اتنے وسیع پیمانے پر تھے۔ ان تئیس سالوں میں مغربی پاکستان میں ان دارالعلوموں کا ایک جال سا بچھ گیا ہے اور یہ برابر پھیلتا جا رہا ہے۔ ان دارالعلوموں کے متعلق دو سوال قوم کے بہی خواہوں کو پریشان کیے ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ دارالعلوم کسی عمومی نظام یا ضابطے میں منسلک نہیں اور مشہور محاورے کے مطابق ہر مدرسہ یا دارالعلوم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کے بیٹھ گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے جیسا کہ مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے سابق امیر مولانا محمد اسماعیل صاحب مرحوم نے ۱۹۶۴ء میں لائل پور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"۔۔۔ ہماری ہونے والی پود اور دینی مدارس کے نو آموز نوجوان تعلیمی انتشار اور بدنظمی کے موجب ہو رہے ہیں۔ وہ دیہات میں چھوٹے چھوٹے مدارس کھول رہے ہیں، جن کا نہ صرف یہ کہ باہم ربط نہیں بلکہ رقابت ہے۔ باہم آویزش ہے۔ تعلیمی ترقی کے بجائے یہ مدارس معاشی جنگ کی آماجگاہ بن گئے ہیں۔ یہ حضرات جماعت کی جیب پر بوجھ ہیں، اور باہم رقابت اور بدنظمی کی وجہ سے مُضر ثابت ہو رہے ہیں۔"

دوسرا پریشان کُن سوال ان عربی مدارس کے نظام تعلیم کا ہے، جو نہ آج کی دینی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے نہ دنیوی ضرورتوں کو۔ اس کا احساس ہمارے بزرگوں کو تقریباً ایک صدی قبل ہو گیا تھا جس کے تحت ندوۃ العلما کی تحریک شروع کی گئی تھی۔ ۱۸۹۴ء میں مولانا حالی نے اس سلسلے میں اپنے ایک مضمون میں جو ندوۃ العلما کے اجلاس میں پڑھا گیا، چند مفید تجاویز پیش کی تھیں، اور جن پر اب تک عمل نہیں ہو سکا۔ مثلاً انھوں نے عربی مدارس کے نصاب میں تاریخ و جغرافیہ، ریاضی اور ہیئت جدید کو داخل کرنے کی تجویز کی تھی۔ لیکن ان مدارس کے نصاب تعلیم اب تک ان مضامین سے معرا ہیں۔ ان سالوں میں تو علوم و فنون میں حیرت انگیز ترقی ہو گئی ہے۔ اس لیے اب تو ہمارا قدیم نظام تعلیم اور بھی زیادہ اصلاح و تبدیلی چاہتا ہے۔ لیکن افسوس نہ ہمارے عربی دارالعلوم اپنے ہاں کے نظام تعلیم

میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کے لیے از خود تیار ہیں، اور نہ کسی حکومتی سطح سے ان کو اس کے لیے آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ بے شک یہ صورتِ حال بڑی رنج دہ ہے، لیکن بد قسمتی سے اس ضمن میں اب تک کچھ نہیں کیا جا سکا۔

زیرِ نظر رسالہ محکمہ اوقاف مغربی پاکستان نے اسی اہم مسئلے کی طرف اہلِ علم کی توجہ مبذول کرانے کے لیے شائع کیا ہے۔ محکمہ مذکور کے مشیر تعلیم نے اس سلسلے میں اپنے پیش لفظ میں دو باتوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، ایک یہ کہ جدید اور قدیم تعلیم کے الگ الگ نظاموں سے ملت کو بڑا نقصان پہنچا ہے اور وہ دو مختلف بلکہ متضاد کیمپوں میں بٹ گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ تقریباً ڈھائی سو سال قبل جب درسِ نظامی کی ترتیب و تشکیل میں اس زمانے کی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا تھا تو آج جب کہ زمانہ بہت بدل گیا ہے، اس زمانے کی ضرورتوں کے پیشِ نظر اس نصابِ تعلیم میں مناسب تبدیلیاں نہ کرنا ایک ملی المیہ ہوگا۔

رسالے کے مصنف الطاف جاوید صاحب نے سب سے پہلے مغرب کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں غیر معمولی ترقی کا ذکر کیا ہے، جس کے نتیجے میں وہاں علوم و فنون کو بڑا فروغ حاصل ہوا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک تو ہم سائنسی علوم میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور دوسرے ہم نے پچھلی دو صدیوں سے نظامِ تعلیم کی تقسیم قبول کر لی ہے۔ ایک دینوی تعلیم دوسری دینی تعلیم۔ اسے مصنف ثنویت پسندی کا نام دیتے ہیں۔ موصوف نے اس پر سخت تنقید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

> "ہمارا تعلیمی نظام پچھلی دو صدیوں سے دو متضاد خانوں میں بٹ چکا ہے۔ ایک طرف قدیم دار العلوم اور دینی مدرسے ہیں، جن میں قدیم دینی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے اور دوسری طرف جدید یونیورسٹیاں ہیں، جو عہدِ حاضر کے علوم سے ذہنوں کی آبیاری کر رہی ہیں۔ اسی طرح یہ مذہبی دار العلوم اور یونیورسٹیاں دو مختلف قسم کے ذہن پیدا کر رہی ہیں، جن میں باہمی کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی۔ زندگی کے مسائل و مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے دونوں کے نقطہ ہائے نظر ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں . . . "

مصنف کے نزدیک ہماری موجودہ ذہنی پس ماندگی اور معاشرتی خلفشار کی ایک بڑی وجہ ہمارے تعلیمی

نظام کی یہ دوئی ہے۔

اس تمہید کے بعد مصنف نے برِ اعظم پاک و ہند میں اسلامی عہد کی ابتدا سے آخر تک جو نظامِ تعلیم رائج رہا اس کا ذکر کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں درسِ نظامی پر تفصیل سے بحث کی ہے مصنف نے بڑے افسوس سے اس رنج و حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ جس دور میں یورپ میں بڑے بڑے فلسفی، سائنس دان اور اجتماعیات کے محقق و مفکر پیدا ہو رہے تھے، ہمارے ہاں کے نظامِ تعلیم کے ناخداؤں سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ وہ نصابِ تعلیم میں کم سے کم شاہ ولی اللہ ہی کی کتابیں ہی شامل کر لیتے، جن میں گو قدیم انداز پر ہی، اجتماعی علوم پر بحثیں ہیں۔ یہ کیوں ہوا، مصنف کے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی :-

"یوں نظر آتا ہے کہ ایک سیاسی سازش کے تحت حضرت شاہ (ولی اللہ) صاحب کی کتابوں کو طلبا کے زیرِ مطالعہ نہیں آنے دیا گیا۔"

لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں۔ اس کی وجہ دراصل مسلمانوں کے عام مذہبی ذہن کا روبہ زوال و جمود رجحان ہے، جس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ مثال کے طور پر سر سید کے بعد علی گڑھ کا فکری مرکز ان کے عقلیت پسندانہ مسلک کو قائم نہ رکھ سکا، دارالمصنفین اعظم گڑھ میں مولانا شبلی کے جانشین ان کے علمی ورثے ہی سے منہ موڑ بیٹھے۔ دارالعلوم دیوبند میں حضرت شاہ ولی اللہ کے علوم پڑھنے پڑھانے کا کسی کو احساس نہ ہوا۔ اور تو اور مصر میں شیخ محمد عبدہ جیسے آزاد اور جرأت مند مفکر عالمِ دین کے وارث سید رشید رضا بنے جو آگے بڑھنے کے بجائے قدامت پسندی کے زیادہ حامی تھے۔

بات یہ ہے کہ ہمارا مذہبی ذہن بتدریج اُن فکری عناصر سے دُور ہوتا جا رہا ہے جنھوں نے عہدِ قدیم میں مسلمانوں کی تہذیب اور علوم و فنون کو وہ عروج بخشا تھا جس نے کہ انھیں کاروانِ انسانیت کا امام اور پیشوا بنا دیا تھا۔

مصنف نے تعلیمی نظام میں منطقِ استقرائی کے بجائے منطقِ استخراجی پر زور دینے سے ہماری علمی و فکری ترقی جس طرح رُک گئی، اس پر بڑی اچھی بحث کی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ آخرالذکر منطق ٹھوس حقائق کو نظر انداز کر کے محض قیاس کو اصل علم قرار دیتی ہے۔ اس کے برعکس منطقِ استقرائی

گرد و پیش نظر اور تجربے میں آنے والے واقعات و حقائق کو اساس بناکر اس سے عملی اصول وضع کرتی ہے۔ ظاہر ہے اس سے تلاش و جستجو اور انکشاف و اختراع میں مدد ملتی ہے۔

آخر میں زیرِ نظر رسالے میں قدیم نظامِ تعلیم کی اصلاح کے سلسلے میں ایک تجویز یہ پیش کی گئی ہے کہ اسلامی فقہ کی تعلیم ایل ایل بی کی کلاسوں کا ایک حصّہ قرار دیا جائے۔ اس سے ظاہر ہے ہماری فقہ میں تازگی اور نئی زندگی آئے گی۔ دوسرے قدیم علم الکلام سے قطع نظر کر کے نئے علم الکلام کی بنیاد سائنسی منہاج پر رکھی جائے۔

ہمارے خیال میں نظامِ تعلیم کی اصلاح کے ذیل میں یہ دو بنیادی باتیں ہیں اور سب سے پہلے انہی سے اصلاح کی ابتدا ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے ان میں سے ایک کا تعلق فکر سے ہے۔ اور دوسری کا مذہب کی روایتی عملی زندگی سے۔ باقی رہا قدیم نصاب میں جدید علوم کا داخل کرنا تو اس کے لیے ہمارے عربی دارالعلوموں کے مہتمم کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ کیونکہ اس کے لیے انھیں لامحالہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل اصحاب کو اپنے ہاں درآمد کرنا پڑے گا۔ اس سے یقیناً اُن کی انتظامی اجارہ داری اور علمی ہمہ دانی پر زد پڑے گی۔ چنانچہ وہ ہر حال میں اس کی مخالفت کریں گے۔

ہمارے نزدیک موجودہ صورت میں ایک عملی حل یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں اس وقت اسلامیات کے جو شعبے قائم ہیں، اُن کی صلاحیتِ کار اور علمی حیثیت کو بہتر بنایا جائے۔ یہ شعبے آگے چل کر عربی دارالعلوموں کے نعم البدل ثابت ہو سکتے ہیں۔

الطاف جاوید صاحب نے اس رسالے میں بار بار یہ بات دُہرائی ہے۔ اور ہمیں اُن کے اس بات کے بار بار دُہرانے کی ضرورت سے پورا پورا اتفاق ہے، اور وہ بات یہ ہے:-

> "کسی بھی ملت کے لیے اس سے بڑھ کر المیہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ نظریاتی طور پر دو حصّوں میں تقسیم ہو جائے۔ اس کی تہذیب، ثقافت اور تعلیم کے دو دھارے ہو جائیں، جس کی سمتیں بالکل مختلف ہوں۔"

یہاں ہم یہ عرض کریں گے کہ ملت صرف نظریاتی طور پر ہی دو حصّوں میں منقسم نہیں لیکن اس کے نتیجے میں وہ دو متضاد اور متحارب کیمپوں میں بھی تقسیم ہوتی جا رہی ہے۔ قوم کے بہی خواہوں کو اس خطرناک رجحان کو روکنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ ہم اس کے پیشِ نظر محکمہ اوقاف کی طرف سے اس مختصر سے رسالے

کی اشاعت کو خاص طور سے بڑی اہمیت دیتے ہیں کہ اُس نے قوم کے تعلیم یافتہ اور سمجھ دار طبقے کی توجہ اس خطرے کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔

باقی یہ کہنا کہ "تاریخ شاہد ہے کہ مدارس ہی کے محصّلین اپنی اپنی صلاحیتوں کی بدولت قاضی القضاۃ وزیر با تدبیر، شیخ الاسلام نیز سپہ سالار و سرلشکر کے عہدوں پہ فائز ہوتے تھے"۔ فی الحقیقت قدیم نظام تعلیم میں ضروری اصلاح کے مسئلے کو اُلجھانا ہے۔ اور بس۔ اس بارے میں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے اگر ان مدارس کے محصّلین کی صلاحیتیں واقعی کافی تھیں تو پھر مسلمانوں کے نظم و نسق میں ابتری کیوں پھیلی۔ اور بعد میں سپہ سالاروں اور لشکروں کو ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک فوجی تربیت و نظام اور فوجی اسلحہ کی ہر چیز یورپ سے کیوں لینی پڑی۔ جہاں تک قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلاموں کا تعلق ہے، ان کی صلاحیتوں کے ناکارہ ہونے کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہوگا کہ آج کسی اسلامی ملک میں یہ عہدے نہیں رہے اور ہر جگہ نئے قانون کو نافذ کرنے کی ضرورت پڑی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ زندگی جس میں اس قدیم نظامِ تعلیم کے محصلین کی صلاحیتوں سے کام چل جاتا تھا، اس تین چار سو سال میں کتنی بدل گئی ہے، اس کو بھی آخر ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اُس زندگی میں زمین چپٹی تھی اور گھومتی تھی، افلاک اور ستاروں کو ہر شخص کی زندگی میں مؤثر ہونا مانا جاتا تھا۔ بادشاہ کا فرمان قانون کا درجہ رکھتا تھا، برادری کے سربراہ کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اور آج کی زندگی کیا ہے؟ کیا اُس زندگی پہ پورا اُترنے والا نظامِ تعلیم آج کی زندگی کی ضرورتوں کا کفیل ہو سکتا ہے۔

ایک اور سوال یہ ہے۔ اُس زمانے کے وزیر با تدبیر کو نہ بجٹ سے کام تھا نہ کرنسی سے تعلق۔ بین الاقوامی تجارت اور قرضے نہیں ہوتے تھے۔ ہائی کورٹوں میں ہیبیس کارپس کا وجود نہ تھا، اور نہ وزیر با تدبیر کو اسمبلی میں جواب دہی کرنا ہوتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اُس زمانے کی تیز رفتار سواری گھوڑا تھی۔ اور آج آواز سے زیادہ تیز طیارے ہیں۔

ہمارے نزدیک اہل علم کا اس طرح کی باتیں کرنا یا تو خود کو ایک خاص حلقے میں مقبول بنانے کی کوشش ہے یا اصل مسئلہ سے ناواقفیت۔

رسالہ "ہمارا قدیم نظامِ تعلیم اور جدید تقاضے" بڑا خوب صورت چھپا ہے۔ سرورق کافی دل کش

ہے۔ اور اُردو ٹائپ بڑا اچھا استعمال کیا گیا ہے۔ جاوید صاحب نے رسالے کے حاشیوں میں کوئی ۷۴ مسلمانوں اور غیر مسلم علما، فلسفیوں، مفکرین، اہلِ قلم اور شعرا کے مختصر حالات قلم بند کیے ہیں۔ اس سے زیرِ نظر رسالے کی علمی افادیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے، یہ حاشیے مختصر ہونے کے باوجود بڑے پُر از معلومات ہیں۔ اور ان کی تیاری میں بڑی محنت کی گئی ہے۔

رسالے کی چھپائی میں ٹائپ کی کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ہم یہاں اُن کا ذکر کر رہے ہیں تاکہ طبع ثانی میں اُن کی تصحیح کر دی جائے۔ صـ۱۷۔ حاشیہ سن عیسوی "ء" کے بجائے "ھ"۔ صـ۲۴ حاشیہ مولانا سندھیؒ کی تاریخ وفات ۲۲ اگست ۱۹۴۴ء ہے ۱۹۴۵ نہیں۔ صـ۲۷۔ حاشیہ (۲۱) ۱۷۸۹ء میں ۱ کا عدد رہ گیا ہے۔ صـ۲۸۔ حاشیہ (۲۴)۔ ۱۸۷۳ء کی جگہ ۱۸۲۱ ہونا چاہیے۔ صـ۲۹ سطر ۵ "درجہ" کے بجائے "وجہ" چھپ گیا ہے۔ صـ۳۱۔ سطر ۱۰۔ پلاسی کی لڑائی کا سن ۱۷۵۷ء ہے۔ یہاں ۱۷۵۲ چھپا ہے صـ۳۷ سطر ۱۰۔ معروفی کی جگہ معروضی ہونا چاہیے۔ حاشیہ (۲۸) مل کا سنِ وفات ۱۸۷۳ء ہے ۱۹۷۳ء نہیں۔ صـ۴۱ فواد کی جگہ الفواد چھپ گیا ہے۔ صـ۴۳ حاشیہ ۳۲۔ یونیورسٹی کی "ر" رہ گئی ہے۔ لارڈ لٹن نے ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ یونیورسٹی نہیں، علی گڑھ کالج کا سنگِ بنیاد رکھا تھا۔ صـ۴۷ حاشیہ ۴۳۔ سرسید کا سنِ وفات ۱۸۷۸ء چھپ گیا ہے۔ ۱۸۹۸ء چاہیے۔ صـ۶۲ حاشیہ ۴۲۔ فارابی کا سنِ وفات ۹۵۰ء ہے۔ یہاں ۱۹۲۹ء چھپا ہے، صـ۶۳۔ حاشیہ ۴۳، سطر ۳۔ دسترس کی جگہ دلچسپی چھپ گیا ہے

اس رسالے کی اشاعت سے اصل غرض اہلِ علم کی توجہ قدیم نظامِ تعلیم میں ضروری اصلاحات کرنے کی ضرورت کی طرف مبذول کرانا ہے۔ باقی جہاں تک اس نظام کو آج کے حالات کے مطابق بنانے کا تعلق ہے محکمہ اوقاف اس سے کبھی غافل نہیں رہا۔ چنانچہ اس وقت بھی یہ مسئلہ زیرِ بحث ہے اور امید ہے کہ علمائے کرام اور ماہرینِ تعلیم کے تعاون سے عنقریب عربی اور دینی مدارس کے لیے ایک نئے نظام کے متعلق تجاویز منظرِ عام پہ آ جائیں گی۔

ڈاکٹر رشید احمد مشیرِ تعلیم و مطبوعات محکمہ اوقاف علمائے کرام کے باہمی نظری اختلافات کو دور کرنے اور انھیں اس دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے اعلیٰ منصب پر فائز دیکھنے کے لیے جو کوششیں کر رہے ہیں، ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ یہ کام ایک ایسا ہی صاحبِ علم کر سکتا ہے جو خود قدیم اور جدید نظامِ تعلیم کا فارغ التحصیل ہو اور خوش قسمتی سے ڈاکٹر صاحب موصوف اس اعزاز کے حامل ہیں۔